Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

آسیہ رفیق

ایک گھر بنانا ہے

حالات و واقعات کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ اپنے بہی خواہوں کے اصرار کو رد کرتا رہے۔ یوں بھی ابھی وہ اس قابل نہ تھا کہ کوئی ذمہ داری قبول کرتا۔ آج کل تو اس کے ذہن میں آمدنی بڑھانے اور پیسہ بنانے کے منصوبے زیرِ غور تھے۔ بے انتہا کوشش اور خواہش کے باوجود جائز اور دیانت داری کے اصولوں کے مطابق دولت کمانا چاہتا تھا۔ دراصل وہ کسی بھی الجھن سے بچنا چاہتا تھا۔ اس کی فطرت میں سیدھے طریقے سے زندگی گزارنے کے جراثیم تھے۔ اور الفت بھابی اس کا مذاق اُڑاتی تھیں کہ

"پیسہ کمانے کا شوق بھی ہے اور قدم بڑھانے سے ڈرتے بھی ہو۔ آج کل حلال کی کمائی ہے کہاں؟ کہیں نہ کہیں لاقانونیت اور چکر بازی ضرور ہے تبھی ہر شخص مالا مال ہے اور تم چھپر پھاڑ دولت کے منتظر ہو حالانکہ رہتے ہو لینٹر کی چھت تلے۔ اگر چھت پھاڑ کر دولت برسی تو تم بھی جان سے گزر جاؤ گے۔"

ان کی ہر کوشش کے باوجود وہ کسی دھوکے فریب کے کاروبار میں شرکت قبول نہیں کر سکا۔ ورنہ الفت بھابی کے بھائی تو پیشکش کر چکے تھے کہ ان کے ایکسپورٹ کے کاروبار میں اس کے لیے بہت گنجائش ہے۔ مگر وہ ان کی پیش کش مسترد کر کے ہر بار زیادہ چڑ چڑا اور مایوس ہو جاتا اور غصہ گھر کے کسی نہ کسی فرد پر اُتارتا رہتا۔ عموماً اس کی بدمزاجی کا شکار اماں ہوتی تھیں۔ وہی اس گھر کی سب سے کمزور فرد تھیں کہ اس کی نالائقی کا چرچا نہیں کرتی تھیں اور کسی قسم کی دھمکی بھی نہیں دیتی تھیں۔ جبکہ بھائی جان کا کام ہی اسے ڈانٹنا، دھمکیاں دینا تھا۔ بھابی تک اس کے نکمے پن پر فضیحتوں سے بھری نصیحتوں کا سلسلہ شروع کر دیتیں تو شام ہو جاتی، ان کی تقریر ختم نہ ہوتی۔ ایک تو الفت بھابی کی ایک نئی پیش کش پر وہ پہلے ہی بھنایا ہوا تھا اوپر سے اس کے گھر میں گھستے ہی بھائی جان نے فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ انہوں نے بات تو اماں سے کہی تھی مگر وہ خوب جانتا تھا کہ مخاطب وہی ہے۔

"سُن رہے ہیں چچا! ابا کیا کہہ رہے ہیں؟" روحی بھلا کسی سے کب پیچھے رہتی۔ اسے تو چچا کو چھیڑنے میں بہت لطف آتا تھا۔

"سُن رہا ہوں۔" وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے۔ ہم شروع کریں تیاری۔ ڈھولک بجائیں۔ گیت گائیں۔"

"فضول باتیں مت کرو روحی!" وہ غرّایا۔

"کیوں۔ یہ فضول بات کیسے ہو گئی؟ آخر آپ کی شادی ہو گی۔ دلہن آئے گی۔"

"نہ شادی ہو گی، نہ دلہن آئے گی۔ وہ جہاں ہے۔ وہیں رہے گی۔ میں دس مرتبہ کہہ چکا ہوں، مجھے شادی سے یا اس نکاح نامے سے کوئی دلچسپی نہیں، جو زبردستی مسلط کیا گیا۔ بس۔"

وہ غصّے میں بھرا اندر جانے لگا۔ تو بھائی جان نے سختی سے کہا۔

"وہ آئے گی۔ اور صرف ایک بار آئے گی۔ جب ہم کہہ رہے ہیں تو اسے لے کر بھی آئیں گے۔ ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن میری مرضی کے خلاف وہ یہاں نہیں آئے گی۔ آپ اسے لائیں گے تو میں۔ میں کچھ بھی کر ڈالوں گا۔ پھر کوئی نہ کہے کہ۔"

"مراد! چپ رہو۔ بڑے بھائی کے سامنے منہ کھولتے شرم نہیں آتی تمہیں؟" اماں چلائیں۔

"یہ معاملہ میری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اماں۔"

"یہ معاملہ ایک عزت دار شریف گھرانے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ جس کی کوئی خطا نہیں کہ اتنی بڑی سزا انہیں دی جائے۔ جب ہم نے تمہارا نکاح کیا تھا اس وقت تم نے انکار تو نہیں کیا تھا۔ پھر تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم اس شریف اور معصوم شخص کی عزت و ناموس سے کھیلو جسے قسمت نے تمہارا سُسر بنا دیا ہے۔ اب اگر۔"

"سُنیے بھائی جان!" وہ جاتے جاتے پلٹ آیا۔ "اس وقت کا طعنہ مجھے نہ دیا کریں۔ اس وقت میں ایک اسٹوڈنٹ تھا محض۔ اور آپ لوگوں کی ناعبداری کو فرض جانتا تھا۔ لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ نکاح میں اتنی جلدی کیوں کی گئی۔ اور۔ ان لوگوں میں ایسی کیا خوبی نظر آئی آپ کو کہ مجھے پابند کر دیا۔ میں نے اب ہوش سنبھالا ہے۔ اور مجھے شک ہے کہ نکاح کی جلدی میں بھی ضرور کوئی راز ہے۔ یعنی فائدہ انہی لوگوں کو اور سارا نقصان میرا۔ واہ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔"

"تو بولے جا۔ اچھا۔ نکمّے، بدتہذیب۔" اماں نے جُھک کر اپنی پرانی چپّل اُٹھائی۔ "مارے جوتوں کے منہ توڑ دوں گی۔ بے حیا! الزام تراشی پر اُتر آیا کمبخت۔ ارے اتنی دیدہ دلیری کہاں سے آئی تجھ میں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ کی اس پرانی چپّل سے منہ تو کیا ایک رُواں بھی ٹوٹنے والا نہیں۔ البتہ چپّل خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ میں الزام تراشی نہیں کر رہا۔ صرف ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ اسرار سے پردہ اُٹھانا مقصود ہے۔ اور بس۔ کس قیمت پر میرا سودا طے کیا ہے آپ نے؟ بتائیے۔"

"ادھر آ نامراد! میں بتاؤں تجھے کہ تیری قیمت کیا طے کی ہے ہمارے تو توتو چپّل سے بھی زیادہ بے قیمت نکلا بدبخت۔ بزرگوں کے فیصلوں کو سودا کہتا ہے۔"

اماں جلال میں آ گئی تھیں۔ اور وہ ان کے جلال سے بے حد ڈرتا تھا۔ ویسے وہ بہت تحمل والی تھیں۔ اور بڑی بڑی باتیں برداشت کر سکتی تھیں۔ مگر اس وقت ان کے چہرے پر ماں کی نرمی نہ تھی۔ غیظ و غضب کے شعلوں سے چہرہ انگارہ بنا ہوا تھا۔ وہ چپکے سے کمرے میں گھس گیا۔

باہر اماں اور بھائی جان اپنے غصّے کا اظہار کرتے رہے۔ وہ کمرہ بند کیے بستر پر لیٹا رہا۔ اس قدر شاک لگا تھا اب چائے مانگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ اس نے بھائی جان کے سامنے زبان کھولنے کی جو جرأت کی تھی۔ اسے اس کے انجام کا علم تھا۔ بھائی جان کو غصہ ہو جائے گی اور وہ اس کی مرضی کے خلاف حکیم سیف اللہ کی بیٹی کو رخصت کرا لائیں گے۔ وہ جو اس کی منکوحہ تھی۔ مگر اس نے آج تک اسے دیکھا نہ تھا۔ جب اس نے نکاح سے پہلے عذر کیا تھا تو اماں نے کہا تھا۔

"لنگڑی لولی نہیں ہے۔ اور بچپن میں ہزار بار تم اسے دیکھ چکے ہو۔ اور اگر وہ ایسی ہوتی۔ تب بھی تجھے اس کو قبول کرنے میں عار نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک اعلا خاندان کی بیٹی ہے۔"

وہ ان دنوں اماں کے سامنے زیادہ بولتا نہ تھا۔ اور نکاح کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں شرماتا بھی تھا۔ ان دنوں اس کے مزاج میں کافی جھجک تھی۔ چونکہ یہ رشتہ بھائی جان نے طے کیا تھا۔ اور اماں بھائی جان کے کسی فعل، کسی فیصلے پر اعتراض نہیں کرتی تھیں اس لیے وہ بھی خاموش ہو گیا مگر اس وقت بھی اس کے ذہن میں دبا دبا سا احتجاج موجود تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ اور گاہے گاہے وہ اظہار بھی کرتا رہا۔ مگر کسی نے اس کے احتجاج کو گردانا ہی نہیں۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا۔"

کہہ کر سب مطمئن ہو جاتے۔ اور وہ بے اطمینانی میں مبتلا ہو جاتا۔

چار سال کے دوران اس نے ایک بار بھی اپنی منکوحہ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ سُنا تھا کہ وہ پردہ نشین خاتون ہیں مگر ایسا موقع بھی نہ آیا کہ کسی شادی بیاہ اور تقریبات میں اس کی جھلک ہی نظر آ جائے۔ رشتے داروں کے ہاں تقریبات میں وہ بھی شریک ہوتی تھی مگر خدا جانے کہاں چھپی ہوتی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ اسے نہیں دیکھ سکا تھا اور جب سے الفت بھابی نے اس کے متعلق مضحکہ خیز باتیں سُنائی تھیں وہ کافی بددل ہو گیا تھا۔ اور اسے اماں سے گلہ تھا کہ انہوں نے آخر ملیحہ میں کیا دیکھا۔

ادھر کچھ دن سے الفت بھابی اسے اکسا رہی تھیں کہ آج کل تو شادیوں میں لڑکے فرمائشی جہیز وصول کرتے ہیں مثلاً الفت بھابی کے والدین اپنی بیٹی کو جہیز میں تمام ضروریات کا سامان دیں گے اتنا کہ سالوں اسے گھر کے لیے کچھ نہ خریدنا پڑے۔ خود الفت بھابی بے حد جہیز لائی تھیں۔ کہ فرنیچر سے سارا گھر بھر گیا اور چچی اماں نے بڑے بڑے برتن بکس بغیر کھولے ہی پڑوس میں رکھوائے۔ خاندان کے تمام بزرگوں کے جوڑے اور چچی اماں کے علاوہ ان کی دونوں بیٹیوں کے زیورات بھی ان کے میکے سے ملے تھے۔ ان دونوں سہی لوگ اختر بھائی کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ اور بعض خواتین تو یہ کہنے سے باز نہ رہیں کہ اختر اگر ساری عمر بھی کماتا تو ایسا قیمتی سامان خرید نہیں سکتا تھا۔

الفت بھابی کو ملیحہ پسند نہیں آئی۔ اس کے گھر کے وہ سبز دروازے جن کا رونق اُڑ چکا تھا۔ گھر والوں کی کم مائیگی کی داستان سُناتے تھے۔ بھلا حکیم

Pain & Pride
FIAZ AHMED
Friends Forever

سیف اللہ کی کیا حیثیت کہ وہ فرنیچر دیں اور خاندان بھر کو جوڑے عطا کریں۔ بقول اماں کے حکیم کے پاس اجداد کی شرافت اور شخصی نیکی کے سوا اور ہے کیا۔ مگر ان کے خیال میں یہی خوبیاں بہت کافی ہیں۔ وہ تو ملیحہ کی بھی تعریف کرتی تھیں۔ ادھر وہ اس سے قطعاً ناواقف۔

الفت بھابی کے بھائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے کے لیے کوٹھی ڈیکوریٹ کرادی تھی۔ اور الفت بھابی کا مشورہ تھا کہ وہ بھی دولت حاصل کرنے کے لیے اپنے سسر کی مدد حاصل کرے۔ ملیحہ سے شادی ان کے خیال میں سراسر نقصان کا سودا تھا۔ اور وہ آج کل کسی نقصان کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے گھر کے لیے فرنیچر، اعلیٰ قسم کے ڈنر سیٹ اور عزت کے لیے چمکتے ہوئے زیور رات بھی درکار تھے۔ اس نے بڑی بھابی کو بھی لالچ دیے تھے۔ مفت میں اعلیٰ قسم کے برتن اور سامان سے گھر بھرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ سرمایہ دار گھر سے دیورانی لائیں۔

مگر ایسی باتیں اس گھر میں پسند نہیں کی جاتی تھیں۔ اور وہ فی الحال کڑھ کڑھ کر وقت گزار رہا تھا۔ اور شادی کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھا۔ کیونکہ ذمہ داری اٹھانے کے لیے اس کے پاس ساز و سامان نہ تھا۔ اور حکیم سیف اللہ کے گھر سے جہیز کی امید نہ تھی۔ اماں نے بھی انہیں منع کر دیا تھا کہ کوئی چیز دینے کی ضرورت نہیں ہمارے گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ حالانکہ ان کے گھر میں فرسودہ بوسیدہ کاٹ کباڑ تھا جسے بڑے پیار اور عزت سے صوفہ، میز کرسی اور شیلف کہا جاتا۔ وہ اماں سے کئی بار کہہ چکا تھا۔ اس سامان کو سڑک پر ڈلوا دیں۔ کوئی ضرورت مند چولہا جلانے کے لیے اٹھا لے جائے گا۔ اس بات پر اماں اسے گھورتی تھیں اور بڑی بھابی تیوری پر بل ڈال کر بڑبڑاتی تھیں۔

"دیکھیں گی، تم کیسا نیا فرنیچر لاتے ہو۔"

"ارے نئے فرنیچر کے لیے ہی تو دولت مند گھر کی دیورانی لانا چاہتا ہوں بھابی،"

کھڑکی میں روحی کا سر نمودار ہوا۔ وہ اس کے لیے چائے لائی تھی۔ اسے روحی پر پیار آگیا۔

"میری گڑیا! بس گھر میں ایک صرف تجھے ہی میرا خیال ہے۔"

اس نے اٹھ کر روحی سے چائے لی۔ تھکے ہوئے اعصاب اور الجھے ہوئے ذہن کو سکون ملا۔

"چچا! میری بات مانیں گے؟" روحی چپکے سے بولی

"ہاں ہاں۔ کہو جان۔ میری گڑیا رانی۔" وہ اس وقت روحی کو سب کچھ دینے پر تیار تھا۔

"تو آپ ایسا کریں کہ شادی سے انکار مت کریں۔ ابا اور دادی بہت خفا ہیں۔ اگر آپ نے زیادہ انکار کیا تو بہت برا ہوگا۔"

"میری بات سننے والا بھی تو کوئی نہیں۔ اری روحی بیٹا۔ اگر تیرے چچا کی شادی اس کی مرضی کے مطابق ہو تو گھر سامان سے بھر جائے۔ تیرے لیے جگمگاتے زیور اور قیمتی جوڑے۔ اور اماں کے۔"

"چچا! ملیحہ آپا بہت اچھی ہیں۔ آپ انکار نہ کریں۔ بس۔ گھر میں روشنی بھر جائے گی ان سے۔"

"مگر ابھی میری تنخواہ بھی بہت کم ہے میں بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے علاوہ ملیحہ سے تو قیامت تک نہیں نبھ سکتی۔ کہہ دینا اپنے ابا جان سے اگر انہوں نے جہیز کو نہ بتایا۔ میرا مطلب ہے حکیم صاحب سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بیٹی کو لیے بیٹھے رہیں۔ میں نہیں رخصت کراؤں گا۔ بوڑھی ہو جائے گی وہ۔ یا پھر وہ اس کی شادی کہیں اور کر دیں۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔"

روحی نے منہ پھلا لیا۔ اور چلی گئی۔ روحی نے اندر جا کر کیا کہا۔ اسے پتا نہ چلا۔ رات وہ کھانا کھانے باہر آیا تو سب لوگ اس سے ناراض تھے۔ اور صبح کو شہزاد نے آکر ابا کا نادر شاہی حکم سنایا۔

"اگر ملو، آفس جانے سے پہلے۔" وہ چلا گیا۔

"ہاں تو برخوردار! پھر کیا ارادے ہیں۔ حکیم صاحب کے ہاں بارات لے کر چلنا ہے تو کچھ تیاری کر لو۔"

وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ "اتنی جلدی؟"

رات کو اس نے روحی سے کہلوا دیا تھا۔ اس نے شاید بتایا نہ ہوگا۔ ڈرپوک۔

"بھائی جان! بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے حالات کوئی بوجھ اٹھانے کے لیے سازگار نہیں۔ اور میں ابھی تو۔"

"تم پر کوئی بوجھ نہ ہوگا۔ ہم جو زندہ سلامت بیٹھے

ہیں۔"

اس نے دور بیٹھی اماں سے کہا "اماں! میں نے کہا تھا کہ آپ حکیم صاحب سے کہلوا دیں۔ جہیز میں کچھ چیزیں میری ضرورت کی بھی ہوں۔ مثلاً موٹر سائیکل۔"

"پاگل ہوا ہے۔" اماں منہ بنا کر بولیں۔

"پہلے تھا۔ اب عقل آگئی ہے۔ یہ بھی کوئی شادی ہے جس میں میری پسند اور ضرورت کی کوئی چیز نہ ہو۔"

"خیر۔ وہاں سے کسی تکیے یا دھاگے کی تو توقع نہ کرنا۔ جو کچھ تمہیں درکار ہے۔ اپنے قوت بازو کی کمائی سے لانا۔ آیا سمجھ میں۔ جوان ہو۔ بوڑھے نہیں ہو گئے ہو۔"

اماں نے دھیمی مگر خفگی آمیز آواز میں کہا۔

"لوگ تو جہیز میں کار، کوٹھی، اے سی اور جانے کیا کیا دیتے ہیں۔"

"ہاں دیتے ہیں۔ مگر حکیم سیف اللہ نہیں دیں گے۔ وہ دے نہیں سکتے حلال کی کمائی آتی ہے ان کے گھر۔ کالا دھن نہیں آتا۔"

"ہونہہ! پھر وہ انتظار کریں۔ میں اپنے قوت بازو کی کمائی سے بیس پچیس سال میں وہ سامان جمع کر لوں جس کی مجھے خواہش ہے۔ تو تیس برس بعد ان کی بیٹی کو اگر وہ زندہ رہی رخصت کرالوں گا۔"

"تم تو بیس پچیس برس میں جمع کرو۔ اور وہ آن کی آن میں لاکر تمہیں دے دیں۔ منہ سے بات نکالنے سے پہلے کبھی سوچ بھی لیا کرو۔"

"میں کچھ نہیں سوچ سکتا اس کے سوا کہ مجھے بھی اس جہیز کی ضرورت ہے جو عام طور پر لوگ دیتے ہیں۔ آخر نقصان میں ہی کیوں اٹھاؤں۔"

"مراد! بہت ہو چکا مذاق۔" بھائی جان انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

"اب تم اندازہ لگا لو۔ کہ کب تک یہ کام کر لیا جائے۔ اگلے ہفتے یا اگلے مہینے۔ دراصل حکیم صاحب بیمار ہیں اور بے حد شریف ہیں کہ آج تک کوئی تقاضا نہیں کیا۔ یہ ہماری انسانیت کے خلاف ہے کہ دیکھ سن کر بھی ان کے کام نہیں آتے۔ بہرحال اب ملیحہ ہماری ذمہ داری ہے۔"

"میری نہیں بھائی جان! میں ابھی شادی وادی کے لیے تیار نہیں۔"

"ابھی۔ یا"

"کبھی نہیں۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا تقریر میں الفت بھابی کی بہن کا انکسار سے مارتا جیسز بھی تھا۔ کار، کوٹھی۔ اور کئی سال تک کی ضرورت کا مکمل سامان۔

بھائی جان کو اچانک غصہ آگیا۔ انہوں نے جو منہ میں آیا وہ سنایا آخر میں کہا "نکل جا میرے گھر سے۔ غدار تو نے چہرہ یہاں قدم رکھا۔"

"بھائی جان!" وہ منمنایا۔

"مر گئے بھائی جان۔ کوئی تعلق نہیں رہا تیرے ساتھ۔" یہ کہا اور ٹھوکر مارتے اندر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی اس کا حوصلہ بحال ہو گیا وہ بھی چلانے لگا۔

"کیوں جاؤں میں۔ کہاں جاؤں، واہ۔ دوسروں کی ہمدردی میں بھائی کو گھر سے نکالیں گے۔ میری تو کوئی بات مانتا نہیں۔ ہر ایرے غیرے کی مروت۔"

بھائی جان نے اس کی آواز سن لی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے میں آکر کھڑے ہو گئے اور سخت اٹل لہجے میں بولے۔

"بکواس نہیں چلے گی۔ ابھی اسی وقت دفع ہو جاؤ۔ میں تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کوئی بات بھی نہیں سنوں گا۔ نکلو۔"

ایک لمحے کو اس کے خون میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ روانی رک سی گئی، لہو جمنے لگا تھا کہ ذلت کے احساس نے اسے گرما دیا۔ لہو پھر سے رواں ہو گیا، چہرے پر سرخی چھا گئی، آنکھیں خون اگلنے لگیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر کسی کی جانب دیکھے بغیر صحن پار کیا اور گھر سے باہر آگیا۔ باہر سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ دفتر جانے والے، اسکول کالج جانے والے، کاریں، بسیں، رکشے۔ وہ پیدل ہی آفس کی جانب چل پڑا۔ غصہ دم بدم بڑھ رہا تھا جوش ہر آن دوگنا ہو رہا تھا۔

"ہونہہ! گھر سے نکل جاؤ۔ اچھا جی۔ غلام ہوں آپ کا۔ نکل گیا۔ تعمیل حکم نہ کروں گا تو زندہ کیسے رہوں گا۔ مگر یہ حکم نہیں مانوں گا آپ کی فرمائش پر رخصتی نہیں کرا سکتا۔ پڑا رہنے دو اسے۔ میری مرضی کے بغیر۔ میری زندگی کے فیصلے۔ واہ۔ اوپر سے زبردستی کہ شادی کر لو۔ حکیم بیمار ہیں تو اپنا علاج خود کر لیں۔ ایسی حکمت کا فائدہ ہی کیا کہ انسان اپنا علاج نہ کرے۔ دوسروں کو ہی بے وقوف بناتا رہے۔"

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korner.com

آفس آگیا تھا۔ غصّے میں وہ اتنا تیز چلتا رہا کہ جو سفر وہ بس میں آدھے گھنٹے میں طے کرتا تھا۔ پیدل پندرہ منٹ میں پہنچ گیا۔ آفس کے کاموں نے اسے ذہنی فکر اور غصّے سے نجات دے دی۔ مگر چھٹی ہوتے ہی یاد آگیا۔ اب وہ کہاں جائے؟ بھائی جان کا حکم وہ ٹال نہیں سکتا تھا شاید انہیں اس کا امتحان لینا مقصود ہو۔

اس کے قدم خود بخود اختر بھائی کے گھر کی جانب اُٹھ گئے۔ جہاں الفت بھابی تھیں۔ مروّت اور حسن سلوک کی دیوی۔ وہ ان سے مدد مانگ سکتا ہے۔ اس نے طے کیا۔ الفت بھابی بے وقت اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ جب اس نے سب داستان کہہ سُنائی تو انہیں اس کے گھر اُجڑنے پر تاؤ آگیا۔ رخصتی نہ کرانے کے منصوبے پر انہیں اتفاق تھا مگر گھر چھوڑنے کے عمل سے وہ متفق نہ تھیں۔ انہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے وہ پھر واپس اپنے گھر آگیا۔ اب اس کے قدم مضبوطی سے اُٹھ رہے تھے اور وہ اعتماد سے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

"اماں!" اُس نے صحن میں آتے ہی پُکارا۔ اماں جہاں بھی تھیں۔ خاموش رہیں۔

"اماں! سُن لیجیے، میں آگیا ہوں۔ اور اپنا حق لینا چاہتا ہوں۔ یہ گھر میرا ہے۔ میرے باپ کے جائے گھر میں میرا بھی تو حق ہے۔ مجھے اپنا حق چاہیے۔ مجھے اس گھر سے نکالنے والے سن لیں۔ کہ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔ اگر ان کا حق ہے تو میرا بھی ہے۔ مجھے بھی گھر چاہیے۔"

اس کی چیخ پکار اماں نے سُنی بھی مگر جواب نہیں دیا۔ پتا نہیں روحی، شہزاد، بھابی اور مومی کہاں چھپے ہوئے تھے۔ وہ دبنگ ہو کر جو زبان پر آیا بکتا رہا۔ پھر کہیں سے بھائی جان کے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ اس کی زبان میں لکنت آگئی۔ بھائی جان نے باہر آکر اُسے گھورا وہ صحن میں کھڑا تھا سٹپٹا کر وہیں کھرّے پلنگ پر گر گیا۔

"ہوں" انہوں نے لمبا ہنکارا بھرا۔ "تو تمہیں حق چاہیے۔" وہ چند لمحے کچھ سوچتے رہے۔ پھر بولے۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا حق تسلیم کرتا ہوں۔ اس گھر میں تمہارا حصّہ بھی ہے۔ تم رہ سکتے ہو۔ مگر میری طرف آنے کی ہمّت نہ کرنا۔ آج سے آدھے گھر پر تمہارا حق ہوا۔ آدھا صحن تمہارا۔ آدھا میرا۔ جس کمرے میں تم ہو۔ وہیں سے برآمدہ اور صحن الگ ہوئے۔ اگر کوئی شک ہے تو پیمائش کر لو۔ روحی، شہزاد! میرا وہ فیتہ لانا۔"

مراد پلنگ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تعجّب اور بے یقینی سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اتنی جلدی بات مان لینے کی اسے توقع نہ تھی۔ اس نے ہر سمت نظریں گھمائیں۔ اس کا کمرہ گھر کے عین وسط میں تھا۔ یہ صحیح تھا۔ مگر ساری مکانیت تو بھائی جان کے حصّے کی طرف تھی۔ اس کے حصّے میں صرف دو کمرے آئے تھے۔ کونے میں تو اسٹور تھا جہاں گھر کا سارا کاٹ کباڑ رکھا جاتا تھا۔ اور۔ صحن میں بھی اس کی طرف بیکار چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہونہہ۔ یہ ملا ہے اسے۔

"اور۔ ابّا کے زمانے کے برتن اور وہ بڑی بڑی تصویریں سنہری فریموں والی اور۔"

"لے لینا۔ میں کسی کا حق نہیں مارتا۔ برتن بھی لے لینا۔" بھائی جان کس قدر رحم دل بنے ہوئے تھے مارے حیرت کے وہ دھم سے پھر پلنگ پر گر گیا۔ چند منٹ بعد روحی بڑے بڑے ڈیگچے، مقالی، موٹے موٹے گلاس اور پیتل کے چھوٹے بڑے چند برتن لوہے کا ایک بڑا سا ٹرنک صحن میں رکھ کر اپنے گھر کے برآمدے میں چلی گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی خوفناک سنجیدگی تھی۔ پھر اندر کمرے میں کچھ آوازیں سی اُٹھیں۔ اور شہزاد بڑی بڑی فریموں والی تصاویر اس کے قدموں میں رکھ کر واپس ہوا اس نے پُکارا۔

"شہزاد سُنو!" اس نے مڑ کر دیکھے بغیر اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

بھائی جان اسی وقت گھر کے باہر چلے گئے۔ وہ ایک ایک کو پکارتا رہا۔

کسی کام سے روحی باہر آئی، پھر شہزاد آیا۔ بھابی الگنی سے تولیہ اتارنے آئیں، وہ پکارتا تو سب ایسے وہاں سے بھاگتے جیسے مُڑ کر دیکھا تو پتھر کے ہو جائیں گے۔ گھر میں ایک ہولناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرا کر اماں کو پُکارا۔ مگر کہیں کوئی آواز نہ آئی۔ اماں کہاں تھیں۔ اگر وہ ان کی تلاش میں بھائی جان والے حصّے کے کسی کمرے میں داخل ہو جاتا۔ تو سب لوگ اسے مار مار کر بھگا دیتے۔ (اسے یقین تھا)

جس آسانی سے یہ بٹوارہ ممکن ہوا تھا۔ اس نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔ بھائی جان نے واضح الفاظ میں اس کے اپنی طرف آنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اور اس نے دیکھا کہ بچے بھی اس کے حصّے میں آنے والے صحن میں قدم رکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ غصّے اور بے بسی نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ صحن میں کونے میں بیکار اشیا کا انبار تھا۔ وہ ڈھونڈ کر دو پلنگ کھینچ لایا۔ اور انہیں کسی طرح سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بارش کی وجہ سے پلنگوں کی پٹیاں کھنچ کر نکون بن گئی تھیں۔ جب وہ انہیں درست کر رہا تھا شہزاد اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اور جب وہ سارے برتن اُٹھا کر برآمدے میں لے جا رہا تھا تب صبوحی کمرے کے دروازے پر کھڑی ہنس رہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے دیگچے کو زور سے زمین پر پٹخ دیا۔

"کوئی کام ڈھنگ کا نہیں ہوتا اس گھر میں کس قدر چکنا دیگچہ ہے۔ میرے ہاتھ گندے ہو گئے۔" ہونہہ۔ کہیں سے جواب نہ آیا۔

اس حصّے میں کچن بھی نہ تھا۔ برتن برآمدے ہی میں رکھ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سب کے آخر میں برآمدے میں جو اسٹور تھا۔ اس کا کچن بنایا جا سکتا ہے۔ مگر وہاں تو بہت کاٹ کباڑ ہے۔ خیر۔ پھر سہی۔ کل ہی مزدور بلوا کر سفیدی کرا لوں گا۔ ہاں۔ وہ اسٹور سے سامان اُٹھا کر صحن میں جمع کرنے لگا۔ شہزاد کا پنگورہ۔ ٹوٹا ہوا بے رنگ سا تھا۔ جب شہزاد اس میں سوتا تھا۔ یہ کس قدر خوبصورت لگتا تھا۔ لوہے کی بڑی ساری کڑاہی۔ دادی اماں اس میں حلوہ سوہن بنایا کرتی تھیں کس قدر رونق ہوتی تھی اس دن۔ بھائی جان اور کفیل بھائی کی نوک جھونک۔ حلوے میں چمچہ چلانے کا مقابلہ۔ دیگ کی کھائی ہوئی موٹی موٹی کتابیں۔ ابّا کس انہماک سے انہیں پڑھا کرتے تھے انہیں سر پر کا ہوش نہ رہتا۔ اماں ناراض ہوتی تھیں۔

"کھانا ٹھنڈا مٹی ہو گیا ہے مگر تمہیں ہوش نہیں۔ ارے کتابیں کہیں بھاگی جا رہی ہیں؟"

کبھی وہ پھوپھو سے کہتیں۔ "تمہارے بھائی کتابیں کھاتے ہیں۔ کتابیں اخبار چاٹنے والا محاورہ اب پرانا ہو گیا ہے۔ دیکھ لو تم کب سے آئی بیٹھی ہو۔ انہیں ہوش نہیں۔ کوئی آئے کوئی جائے۔ انہیں تو پتا ہی نہیں چلتا حالانکہ انہیں خبر دے دی جاتی ہے مگر یوں کھوئے رہتے ہیں جیسے کسی اور دنیا میں رہتے ہوں۔"

اب ابّا نہیں رہے۔ کسی اور دنیا میں جا چکے تھے تو ان کی کتابیں بیکار سمجھ کر اسٹور میں پھینک دی گئی تھیں۔ لوگ جانے والوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کی محبوب اشیا سے بھی ناتا توڑ لیتے ہیں۔ اس نے کتاب اٹھائی گرد سے اَٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ لگایا تو دھول اُڑ کر اس کی ناک میں گھس گئی اسے ایک چھینک آئی۔ ابّا کی زندگی میں وہ کتابوں کو ہاتھ لگا لیتا تو وہ دور سے ہی کہتے۔ "دیکھو بیٹا۔ ہاتھ لگا رہے ہو تو پڑھنا بھی پڑے گا۔ صرف چھو لینے سے علم نہیں ملتا۔ کتاب خراب ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر علم حاصل کرنا ہے تو پھٹ بھی جانے تو مضائقہ نہیں۔ پڑھنے والا اسے خود ہی جوڑ لیتا ہے۔ علم کی لگن ہونی چاہیے۔"

اسے ابّا کی زندگی میں کبھی علم کی لگن نہیں ہوئی تھی۔ مگر ان کی حالت زار دیکھ کر جی بھر آیا۔ یہ ابّا کی محبوب کتب جن کو انہوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ کس لاپروائی اور بے قدری کے عالم میں دیمک کی غذا بننے کو چھوڑ دی گئی تھیں۔ ساری کتابیں اُٹھا کر وہ برآمدے میں آگیا۔ کسی میلے کپڑے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ بھابی بہت صفائی پسند منتظم خاتون تھیں۔ برآمدے میں کوئی فالتو چیز نہیں تھی۔ روحی اپنے برآمدے کے کچن میں جا رہی تھی بے خیالی میں اس نے پُکار لیا۔

"روحی۔ گڑیا ذرا ایک میلا کپڑا ——"

بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی۔ روحی اَن سُنا کر کے کچن میں جا گھسی۔ دو تین منٹ اس نے انتظار بھی کیا۔ شاید وہ کچھ کہے بغیر کوئی کپڑا اِدھر پھینک دے۔ مگر وہ تو کوئی دیگچی اُٹھائے کچن سے نکلی اور کمرے میں گھس گئی۔ اسے یاد آگیا۔ آج بٹوارہ ہو گیا ہے۔ بچوں کو اس کے کام کرنے سے منع کر دیا ہو گا۔ بات کرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی ہو گی تبھی تو روحی بے نیازی سے گزر جاتی ہے۔ ورنہ مراد گھر میں ہو اور روحی اس سے بات نہ کرے۔ وہ تو بہانہ بنا بنا کر اس کے کمرے میں آتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے قصّے، اسکول کے واقعات، بہن بھائی سے لڑائی کے مکالمات۔ سب کچھ مراد کو نہ سُنا

Scan & PDF FIAZ AHMED Pakistanipoint.com

لیتی اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔

وہ کتابیں ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ کہ اماں کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ سامنے کے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی شاید اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ مگر بڑے صاحبزادے نے ان پر بھی پابندی لگا دی ہوگی۔ تبھی انہوں نے مراد کو پکارا نہ اس کے پاس آنے کی کوشش کی۔ ماں ہو کر انہوں نے اپنے تنہا بیٹے کی پروانہ کی بلکہ بڑے وسیع بہادر کی حمایت میں اس کو نظر انداز کر دیا۔

کتابیں پرانے پلنگ پر ڈال کر وہ اپنے کمرے سے تولیہ اٹھا لایا۔ اور سب کو جھاڑ جھاڑ کر رکھا ساتھ ہی زور زور سے بولتا رہا۔

"کسی کو علم کی کیا قدر۔ قیمتی کتابیں، ابا نے کس شوق سے خریدی تھیں۔ اور کتنے ذوق شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ کسی کو پروا بھی نہیں۔ پھینک دیں ادھر۔ اب چاہے کیڑے کھائیں یا مٹی۔ ابا کی روح کو کتنا صدمہ ہوتا ہوگا۔ افسوس انسان کے گزر جانے کے بعد اس کی چیزوں کی کیسی بے قدری ہوتی ہے۔ خدا کا خوف نہیں آتا۔ کہ۔ افوہ۔ آدھی کتاب دیمک کھا گئی۔ خیر۔ کسی کو ضرورت نہیں تو نہ سہی۔ مجھے ابا کی نصیحت کا پاس ہے۔ میں یہ کتابیں احتیاط سے رکھوں گا۔ اور پڑھوں گا۔ ابا کو یاد رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ ہو نہہ سب کو حلوے مانڈے کی پڑی رہتی ہے۔ کتابوں کی کیا فکر۔ غارت کر دیں۔ ارے یہ تو کتابیں ہیں کاغذ کی۔ انسان کی ہی کیا قدر ہے اس گھر میں۔"

وہ پھٹی کتابوں کے علیحدہ علیحدہ صفحے احتیاط سے اٹھا کر رکھتا۔ اور کمرے سے کسی ہنسی کی آواز سنائی دیتی تو جھلا جاتا۔ اور چیخ پڑتا۔

"ہنستے ہیں۔ حد ہو گئی۔ ابا کے نام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

سارا جسم گرد میں اٹ گیا تھا۔ کتابیں پلنگ پر رکھ کر وہ غسلخانے میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو صحن میں اندھیرے کا راج تھا۔ برآمدے کی لائٹ جلائی تو پورا برآمدہ بلکہ صحن تک روشن ہو گیا۔ اور اسے بھابی کے کمرے کے پردے سے نظر آ گئے۔ تب یاد آیا کہ لائٹ اس کے حصے میں ہے۔ اس کا فائدہ "ان" لوگوں کو کیوں پہنچے۔ اچانک پرانے پلنگوں کا مصرف سمجھ میں آ گیا۔

دونوں پلنگ اس نے برآمدے میں لمبائی میں کھڑے کر دیے۔ مگر روشنی چھن چھن کر دوسرے حصے کو منور کرتی رہی۔ تب وہ دوڑ کر اندر گیا۔ پلنگ پر دو چادریں تھیں، دونوں اس نے پلنگوں پر ڈال کر انہیں دیوار کا رنگ دے دیا۔ روشنی اب بھی جا رہی تھی۔ مگر کم۔ ادھر سے صبو حی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ شاید بچے چاچو کو کام کرتے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"ہنسو۔ خوب ہنسو۔ میں نے یہ پردہ اسی لیے ڈالا ہے کہ نہ تم مجھے دیکھو نہ میں تم کو۔ اپنے والے حصے میں بلب گلو الینا۔ سُنا۔ میری روشنی ہے یہ۔ میں کیوں دوں۔"

دوسری سمت خاموشی چھا گئی۔ کمال تو یہ تھا کہ بھابی جو بلند آواز میں بولتی رہتی تھیں آج ان کی آواز کہیں بند تھی۔ اس نے آج کافی کام کیا تھا۔ تھک ہو گئی تھی۔ الفت بھابی نے چائے تو پلوائی تھی مگر کھانا اس نے دن بھر نہیں کھایا تھا۔ بھوک نے بے چین کر دیا۔ تو اسے کھانا مانگتے ہوئے شرم سی آئی۔ کمرہ لاک کر کے وہ صحن سے باہر آ گیا۔ ایک عجیب سی خوشی کا احساس بھی تھا۔ آزادی کی ترنگ بھی۔ جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتا تھا باہر طرف سے پکار شروع ہو جاتی۔ "کہاں جا رہے ہو۔ کب آؤ گے کھانے کے وقت آ جانا۔"

آج آزادی سے باہر آیا تھا کوئی آواز اسے روکنے کے لیے نہیں اٹھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ صحن کا دروازہ اس کے حصے میں تھا۔ دوسری طرف گلی کا راستہ نہ تھا۔ اب وہ لوگ ڈرائنگ روم کے دروازے سے آ جا یا کریں گے۔ اس دروازے کو تو بس مہمانوں کی آمد کے وقت ہی کھولا جاتا تھا۔

گلی سے مین روڈ آنے تک اس کی بھوک بڑھ گئی۔ جیب میں رقم تو تھی۔ مگر بہت نہیں۔ وہ من پسند کھانا کھانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ مگر پھر بھی کباب تو لے ہی سکتا تھا۔ گرم گرم نان خوشبو دے رہے تھے۔ کبابوں کی بھی الگ ہی مہک تھی۔ بچپن سے ہی سُنا تھا کہ بازار میں بیٹھ کر کھانا کھانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اماں کو بازار کے کھانوں سے ہی چڑ تھی نہ کہ ہوٹلوں میں جا کر کھانا۔ مگر آج اس نے یہ بندش توڑنے کی ٹھانی۔ گو کہ اندر سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"چل۔ کھانا گھر لے جا کر کھائیں۔ بازار میں تو اتنی آنکھیں ہیں۔ ان میں بد نگاہی بھی ہوگی۔ اماں کو کھانے میں نظر لگ جانے کا خدشہ رہتا تھا وہ خود ہمیشہ گھر میں کھاتا تھا۔ کبھی تفریحاً بھی کھڑے ہو کر نہیں کھایا کہ لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے۔

"یہی کہیں گے کہ گھر میں ماں بہن نہیں ہیں۔ یا گھر والے پھوہڑ ہیں کہ لڑکے کو پسند کا کھانا نصیب نہیں۔ بازار سے لے کر کھا رہا ہے۔" اماں کہتیں۔

مگر آج اس نے کباب والے کی دکان پر کھڑے ہو کر بے تابی سے نان کباب کھائے۔ اتنا لذیذ کھانا اس نے کب کھایا تھا۔ سلاد اور دہی کی چٹنی مزا دے گئی سب کے آخر میں ٹھنڈے پانی کا جگ۔ پورا پانی پی گیا۔ پیٹ پھول گیا۔ اور وہ ایک پان لے کر کھاتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ پان میں خوشبو کی گولیاں تھیں۔ گزرتے ہوئے لوگ اس کو دیکھنے لگتے۔ احتشام صاحب تو ٹھٹک سے گئے۔ انہوں نے کبھی مراد کو پان کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ گھر کا دروازہ وہ باہر سے بند کر گیا تھا۔ مبادا کوئی اس کی غیر موجودگی میں استعمال نہ کر لے۔

اندر آ کر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔

"کھانا بہت مزیدار تھا۔ تو کباب والے کے ٹھیلے سے کھا کر آیا ہوں۔ کیا خوشبو دار نان تھے۔ اور کیسے لذیذ کباب۔ آہا مزا آ گیا۔ میں نے تو زندگی بھر اس قدر لذت دار کھانا نہیں کھایا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اب روز مزے مزے کے کھانے ملیں گے۔"

زور زور سے کہتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا۔ اور کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر کہیں سے کوئی آہٹ ملی۔ نہ جواب آیا۔

مزیدار کھانے نے رات کو رنگ دکھایا۔ بھوک میں نان کچھ زیادہ کھا لیے تھے۔ سوتے میں اسے لگا کوئی اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا ہے اور اس کے پیٹ کو اپنے حیوانی پنجوں سے مروڑ رہا ہے۔ اس کا گلا گھونٹ گیا تھا اور پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ آنکھ کھلی تو خوف سے اس کا برا حال تھا۔ شاید سوتے میں وہ چیختا رہا تھا۔ پیٹ میں شدید درد تھا۔ کروٹ بدلتا اور کراہتا رہا۔ کتنی دیر گزر گئی۔ درد میں کمی نہیں آئی تو بستر سے اتر کر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر برآمدے اور صحن تک آ کر اندازے لگاتا رہا کہ کوئی اس کی آواز سن رہا ہے یا نہیں۔ اب بے چین رات کو اسے بخار ہو گیا تھا۔ سوتے میں وہ کراہتا رہا۔

اماں نے کمرے میں اس کی آواز سن لی تھی۔ اور آدھی رات کو سخت سردی میں وہ اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ بعد میں انہوں نے اسے تاکید کی تھی کہ کمرہ اندر سے لاک کر کے نہ سویا کرے تاکہ وہ جب چاہیں آ کر اسے دیکھ لیں۔ اور وہ اکثر اس کی خیر خبر لیتے رضائی اوڑھانے یا طبیعت کا پوچھنے آ جاتی تھیں۔ اسے کتنی طمانیت ——— ہوتی تھی۔ اور لاڈ میں وہ بچہ بن کر اماں سے لپٹ جاتا اور مند کرتا۔

"اماں آپ میرے کمرے میں ہی سویا کریں۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔"

اماں کو روحی اور صبو حی کی فکر تھی وہ انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ مگر رات کو اٹھ کر مراد کو ایک نظر ضرور دیکھ جاتی تھیں۔

رات بھیگ رہی تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ اور صحن تاروں بھرے آسمان تلے روشنی اور اُمنگوں کا ترجمان لگ رہا تھا۔ مگر۔ مراد کی قسمت کے ستارے پتا نہیں کس برج میں سو رہے تھے۔ کہ کوئی اُمید کی چمک تک نہ تھی۔ رات کے پچھلے پہر وہ تنہا صحن کی لمبائی ناپ رہا تھا۔ اب پیٹ میں انتاڑیاں بھی نہ تھا اور اگر تھا بھی اس تکلیف پر اپنوں کی بے مروتی کا درد حاوی ہو گیا تھا۔ اسے اماں کی یاد آ رہی تھی۔ اماں کا پیار بھرا لمس۔ پُرشفقت ہاتھوں کی نرمی اور حرارت۔ کاش اماں بھائی کو سمجھاتیں۔ وہ ایسا ظالمانہ فیصلہ نہ کریں۔ بھائی جان طبیعت کے سخت تھے مگر اماں کی بات کو رد کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن ہے اماں کو علم ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ——

مگر کیا ہو سکتا ہے۔ بھائی جان نے، ان کی بیگم اور بچوں نے اماں کو اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا ہوگا ورنہ وہ مراد کی بے چینی، اس کے درد سے واقف ہو کر آ جاتیں اور مامتا شفا بن کر اس کے ہر درد کو رفع کر دیتی۔

برآمدے میں دونوں پلنگ کھڑے تھے۔ ان پر چادریں بھی پڑی تھیں روشنی پھیر بھی دوسری طرف آزادی سے جا رہی تھی۔ کوئی نہیں آ کر پوچھتا اس خنک رات کے پچھلے پہر اس پر کیا گزر رہی ہے۔ غنودگی میں اس نے پلنگ کو زور کی ٹھوکر رسید کی۔ پلنگ دھڑام سے نیچے جا گرا۔

Scan & Uploaded By FIAZ AHMED pkpoint.com

اس کے پیر میں بھی خاصی چوٹ آئی۔ وہ جھلا کر کمرے میں آگیا۔ کیسے ممکن ہے کہ پلنگ کے گرنے کا دھماکہ کسی نے نہیں سُنا۔ اماں کی نیند اتنی گہری نہیں۔ وہ تو گھر کے افراد کی کھانسی اور چھینک سُن کر ہی جاگ جاتی تھیں۔

وہ چُپ چاپ بستر پر لیٹ گیا اور رنج و ملالیوسی نے اسے ہر سمت سے نرغے میں لے لیا۔

"اماں! اماں!" اس نے تین چار بار پکارا۔ چہار سو خاموشی تھی۔ اس کی آواز نے اماں کے کمرے کی خاموشی میں دراڑیں ڈالی ہوں گی۔ ان کے دل پر دستک دی ہوگی۔ مامتا کو بیدار کیا ہوگا۔ مگر۔ وہ بھائی جان کے حکم کی پابند ہو گئی ہیں۔

صبح سہانی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو گھر کی خاموشی نے استقبال کیا۔

"اب۔ ناشتہ۔ ناشتے کی باری ہے۔" اس نے برآمدے میں آکر شور مچا دیا۔

"یہ پلنگ کس نے گرا دیا ہے۔ کس نے توڑی ہے پردے کی دیوار؟ یہ میرا گھر ہے۔ میری مرضی میں کسی طرح بھی رہوں۔ ہاں اب میں بازار جا رہا ہوں۔ ناشتا کرنے کے لیے۔ اب تو اپنے مزے ہی مزے ہیں۔"

مزے کا چرچا کرتے ہوئے وہ صحن کے راستے گلی میں آگیا۔ پتا نہیں اماں نے سُنا تھا کہ نہیں۔ اس دن آفس سے الفت بھابی کے گھر جاتے ہوئے وہ پُرجوش نہ نہ تھا۔ سُست اور بے چین تھا۔ الفت بھابی نے سب سُن کر اسے تسلی دی۔

"اماں کی فکر مت کرو۔ ان کی ناراضگی چند دن کی ہے۔ ذرا صبر سے کام لو۔ تھوڑے دن کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس دن انہوں نے اپنی بھتیجی کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ بھائی بیٹی، داماد کو نیویارک اور سوئٹزرلینڈ بھیجیں گے اپنے خرچ پر سیر و تفریح کے لیے۔ شاپنگ کے لیے الگ رقم دیں گے۔ جہیز کیا ہوگا۔ بس پوری کوٹھی اعلا ترین ساز و سامان سے بھری ہوئی۔ گیراج میں شاندار کار۔ ڈرائیور خانساماں۔ ہر سہولت اور آرام۔ نوکروں کی تنخواہ وہ خود اپنی جیب سے دیں گے۔ اللہ نے انہیں بہت سی دولت دی ہے۔ بچوں کے لیے ہی ہے سب۔ تم ایک بار

ہاں تو کرو۔ میں کل ہی چٹ منگنی پٹ بیاہ کرا دوں گی۔ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ شادی کے بعد پھر کوئی کیا کر سکے گا۔ کچھ نہیں۔ تمہاری قسمت بدل جائے گی۔ عیش کرو گے۔ پورے خاندان میں تم جیسا دولت مند کوئی نہ ہوگا۔"

مراد سر جھکائے ان کی لالچ دینے والی پیش کش پر غور کرتا رہا۔ پہلے تو یہی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ کل تک بہن کے جہیز اور اس کے حسن کی تفصیل بیان کرتی ہوئی بھابی آج اچانک بھتیجی تک کیسے پہنچیں۔

دوسری وجہ اس پیش کش کو ٹھکرانے کی یہ بھی تھی کہ وہ بھابی کے بھائی کے کاروبار اور ان کی دولت سے واقف تھا۔ جو سراسر بے ایمانی اور دغا فریب کے ذریعے کمائی گئی تھی۔ اور کسی وقت بھی حکومت کی نظر میں آنے کی دیر تھی کہ سب کچھ منہدم ہو جاتا۔ پھر اس نے ان بھتیجی صاحبہ کو بھی دیکھا تھا۔ جن کے کسی انداز میں دلکشی نہ تھی۔ اور نخرے اتنے کہ۔ وہ تو کیا اس کی سات پشتیں بھی نہیں اُٹھا سکتی تھیں۔

الفت بھابی کے گھر سے وہ اپنے گھر آگیا۔ صحن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا پھر صحن ہی میں ٹھٹھک گیا۔ برآمدے سے صحن تک ایک دیوار۔ سچ مچ کی حد بندی۔ بیچارہ اسی سے برداشت نہ ہوا چیخنے لگا۔

"کیوں اٹھائی ہے یہ دیوار؟ کس نے بنائی ہے؟"

اندر سے بھائی جان نے کہا۔ "تم نے ہی ابتدا کی تھی۔ برآمدے میں پلنگوں کی دیوار بنا کر اپنا حصّہ علیحدہ کر دیا تھا۔ وہ پلنگ کوئی بھی گرا دیتا تھا۔ اب پکا کام ہو گیا۔"

دیوار بننے سے اس طرف کا حصّہ بھی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اور چھوٹا سا گھر عجیب تنگ تنگ لگنے لگا تھا۔ اسے پھر غصّہ آنے لگا۔ مگر غصّے سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا اس لیے وہ کھانے کی فکر میں ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ دیگچے بڑے بڑے تھے۔ کھانا کس طرح پکتا ہے۔ کہاں پکے گا۔ اس نے کئی بار سوچا۔ پھر بازار کا رخ کیا۔ مگر اب وہ نان کباب سے ڈر سا گیا۔ سبزی خرید کر لے آیا۔

"میں آج آلو پکاؤں گا۔ خوب مزیدار۔"

اس نے حلق پھاڑ کر کہا۔ پتا نہیں اب آواز اس طرف جاتی ہے۔ یا اینٹوں سے ٹکرا کر وہیں دم توڑ دیتی ہے۔ چولہا بھی کہاں تھا۔ دو اینٹیں رکھ کر کونے سے کاٹ کباڑ لایا اور آگ جلا دی۔ آگ خوب بھڑک گئی تو پتیلی میں آلو ڈال کر پانی بھر کر چولہے پر چڑھا دیا اور انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے وقت اسے اماں بہت یاد آئیں۔ کیسی، کیسی انہونی صندوں کو پورا کرتی تھیں وہ بغیر احسان جتائے۔ کوئی عذر کیے بغیر اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا فرض بنا لیا تھا انہوں نے۔

ایک گھنٹے بعد آلو اُبلے۔ وہ چھیل چھیل کر بے قراری سے کھانے لگا۔ اسے نمک لانا بھی یاد نہیں رہا۔ پتا نہیں کیا کیا چیزیں چاہیے ہوں گی۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ گھر میں کیا آتا ہے۔ اور پکانے کھانے کی کتنی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ گھر کے ہر کام کی ذمے داری بھائی جان پر تھی۔ وہ کبھی کبھی خفا بھی ہوتے تھے۔

"شہزادے کو گھر کے کام سے کیا مطلب۔ ارے کبھی دو آنے کی ہلدی اس سے بھی منگوا لیا کرو۔ اسے پتا تو چلے بھاؤ کیا ہے۔"

پھیکے آلو بے مزہ تھے۔ دیوار کے پیچھے کچن میں کھانا پک رہا ہوگا۔ سب کھانے بیٹھے ہوں گے۔ کیا اماں اس کے بغیر کھانا کھا لیتی ہوں گی۔ یا انہیں دکھانے کے لیے لقمہ بناتی ہوں گی۔ جب وہ بیمار ہوتا۔ اور جتنے دن اس کو کھانے کا پرہیز ہوتا۔ اماں بھی بغیر کھائے پیے دن گزار دیتیں۔ وہ دیوار کے پاس آکر مُکّے برسانے لگا۔ "اماں۔ اماں۔ میری اماں۔"

شاید اس کی فریاد سُن لی گئی۔ اندر سے ایک دھماڑ سنائی دی۔ "کیا ہے؟"

"مجھے اماں چاہییں۔" وہ بھی زور سے چیخا۔ "اماں! یہاں آجاؤ۔"

"بھاگ جاؤ۔ اماں یہیں ہیں۔ جو جہاں تھا، وہیں رہے گا۔"

"نہیں اماں میرے پاس رہیں گی۔ وہ میری اماں ہیں مجھے دے دیں۔"

"بدبخت۔ ماں کا بٹوارہ کرے گا؟"

بھائی جان سخت جلال میں تھے مگر دیوار کے اس طرف۔

"مجھے اماں کی ضرورت ہے۔" وہ پھر چلایا اور دیر رات تک چیختا رہا مگر پچھلی طرف دروازوں کے بند ہونے کی آوازیں اور اس کے بعد خاموشی۔ کیسی تنہائی تھی۔ اور کیسی سخت سزا۔ کل تو اسے تنہائی کا احساس نہ تھا۔ مگر آج۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ بے بس۔ "اماں آپ آجائیں میرے پاس۔" وہ بستر پر گر کر چھوٹے بچے کی طرح روتا رہا۔ تین دن اسی زہرناک تنہائی میں گزر گئے۔ اس کی جیب خالی تھی۔ اب اس کے پاس پیسے بھی نہیں رہے۔ اور مہینہ ختم ہونے میں کافی دن تھے۔ پتا نہیں پہلے تو پیسے اتنے بے برکت نہیں ہوتے تھے۔ وہ بھوکا بیٹھا رہا۔ اور برآمدے کی اینٹوں والی دیوار کو گھورتا رہا۔ رات کو صحن میں کھٹکا سا ہوا۔ ایک خوش آئند آواز کفیل بھائی گنگناتے اندر آئے اور برآمدے میں کھڑے ہو کر سخت حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"ہائیں! یہ میں کس کے گھر میں گھس گیا۔"

"ٹھیک گھر میں آئے ہیں کفیل بھائی۔" وہ اداسی سے بولا تب انہوں نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور ہنس دیے۔

"کفیل بھائی! آپ اماں سے مل کر نہیں آئے؟"

اس نے بغیر تمہید کے انہیں اماں سے جدائی کی غم بھری داستان سُنا دی اور مجبور کیا کہ ابھی جائیں اور اماں کو پیغام دیں۔ بھائی جان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کفیل بھائی سست قدم اُٹھاتے باہر چلے گئے گھنٹہ بھر وہ ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ آئے تو کافی مایوس تھے۔

"میاں! ان کی تو بس ایک خواہش ہے۔ کہ تم بڑے بھائی کے حکم کو مانو۔ اور اب تو دیوار کھڑی ہو گئی ہے۔ گویا دلوں میں بھی دیوار اُٹھ گئی۔ اور خالہ جان ابھی بیٹے، بہو، پوتے، پوتیوں کو چھوڑ کر تمہارے پاس آنے سے قاصر ہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ گزارا کیسا چل رہا ہے۔"

وہ تیزی سے اپنی خالی جیب اور ضرورت کے سامان کی مہنگائی کا رونا روتا رہا۔ کھانا پکانا، ناشتا بنانا، گھر صاف کرنا، وہ تو ان کاموں میں کورا تھا کفیل بھائی مزے سے پان چباتے رہے پھر بولے۔

ذکیہ بلگرامی کے ۲ نئے ناول

بندھن

خوبصورت چار رنگا سرورق، مجلد بڑا سائز، قیمت ۲۱ روپے

گئے موسم کے گلاب

چار رنگا خوبصورت سرورق، ۳۰ روپے، پیپر بیک ایڈیشن قیمت ۱۵ روپے

ڈاک خرچ فی کتاب ۵ روپے، لیکن دونوں کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ جملہ ۷ روپے

شفیع برادرز، پوسٹ بکس ۵۸۶ کراچی

Scan & PDF FIAZ AHMED FriendsKorner.com

"قرض تو میں تمہیں دے دوں گا، مگر یہ کوئی حل نہیں۔ یا پھر بھائی کی بات مان۔"

"چھوڑیے، میں نے کہا ہے کہ لمبا چوڑا جہیز لانے والی ہی میرے گھر آسکتی ہے، آخر مجھے کس جرم کی سزا ملے، کوئی بتائے، تنخواہ میں میرا گزارا ہی مشکل ہے، حکیم سیف اللہ کی بیٹی کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ کوئی پیسے والی ہو، باپ کے گھر سے رقم لائے، تو میں خوش۔"

"شرم کر میرے یار، بیوی کا پیسہ کھا کر بے غیرت کہلائے گا۔ تف۔"

"پھر، کب تک اپنے ہاتھ سے کچا پکا بناؤں، میرے تو پیٹ میں درد رہنے لگا۔"

"میری مان لے اُستاد، پکا پکایا کھانا، پوری خدمت گزاری۔"

"بتائیں، بتائیں۔ کوئی نوکر، مگر تنخواہ بھی تو۔"

"بے تنخواہ یار۔ بالکل بے تنخواہ۔"

"میرے کفیل بھائی! پھر بتائیے جلدی سے۔"

"دیکھ بیٹا، ایک بہترین حل ہے یہ۔" کفیل بھائی مزے سے پان منہ میں گھما رہے تھے۔ "اور اس سے ایک پنتھ چار پانچ کاج ہو جائیں گے۔"

"بتائیے۔"

"تو سن بھائی! اب گھر الگ ہو ہی گیا ہے، کوئی دیکھنے سننے والا بھی نہیں، میری مان اور حکیم سیف اللہ کے گھر سے اپنی منکوحہ کو لے آ۔ پکائے گی، استری کرے گی، گھر صاف کرے گی، تیری ہر خدمت کو اپنا فرض ——"

مراد کفیل بھائی کو گھورنے لگا۔ "یہ بات بتا رہے ہیں آپ۔ حل۔"

"ہاں۔ یہی حل ہے، ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے، سُنا ہے حکیم صاحب کے بیٹے خلع کے لیے وکیل سے بات کر رہے ہیں، بے عزتی ہو جائے گی استاد، اگر سچ مچ وہ خلع کا مقدمہ جیت گئے۔" کفیل بھائی بہت اُداس تھے۔

مراد کے دل پر جیسے کسی نے پتھر مارا، چوٹ تو لگی، جانے کیسی چوٹ تھی کفیل بھائی حل پیش کر کے اس کی نیند حرام کر کے چلے گئے، دو دن وہ دفتر بھی نہیں گیا، کچہری کے چکر لگاتا رہا۔ مارے اُسے علم ہوا کہ حکیم سیف اللہ کے بیٹوں نے خلع کے لیے کسی وکیل سے بات کی ہے، اس وکیل کو بھی اس نے تلاش کر لیا، بات کی، اس کے بتایا کہ سیف اللہ صاحب سے اس کی یاد اللہ ہے۔ ایک بار انہوں نے ان کی بیٹی کا علاج کیا تھا، وہ ان کا شکور ہے اور یہ کہ حکیم کے بیٹے معلوم کرنے آئے تھے کہ کیا خلع کے مقدمے کے لیے لڑکی کو عدالت کچہری میں تو نہیں آنا پڑے گا، بس اتنی سی بات تھی۔

"اور آپ نے ان سے کیا کہا؟" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"یہی کہ بعض صورتوں میں آنا بھی پڑتا ہے۔"

مراد کا دل چاہا وہیں ناچنے لگے۔ شرف اللہ اور فیض اللہ بڑی لمبی ناک والے تھے، بہن کو کچہری میں لے جانے سے پہلے خودکشی تو کر سکتے تھے، رُسوائی مول نہیں لے سکتے تھے، اس روز وہ الفت بھابی کی طرف گیا تو مطمئن تھا، الفت نے اس کو روز سے زیادہ پُر اعتماد دیکھا تو حیران ہو کر سوال کر لیا۔ مراد نے سادگی سے بتا دیا۔ الفت کی تیوری چڑھ گئی۔

"تم تو سلیحہ کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے، اکلاب اس میں صرف اب کے پر لگ گئے ہیں، جو تم اس وکیل کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔"

"نہ نہیں بھابی، بات یہ نہیں ہے۔ وہ تو میں صرف معلوم کرنے کے لیے۔"

"ارے چھوڑو مراد۔" وہ بے اعتنائی سے بولیں۔ "اگر وہ تمہارے سامنے آجائے گی تو تم اپنے مطالبات، خواہشات سب بھول جاؤ گے، یہ تو میں ہی پاگل تھی کہ کبھی کوئی کبھی کوئی اچھی اچھی لڑکیاں بتاتی رہی، تم سب مرد ایسے ہوتے ہو، ظاہر ہے کہ برسوں پہلے نکاح ہو چکا ہے تو نکاح تو ضرور ہو گا۔"

"ارے نہیں بھابی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، ایسا ہوتا تو، میں انکار ہی کیوں کرتا، اور بھائی جان سے بھی اس لڑائی۔ سچ میں تو تنہائی سے تنگ آگیا، کھانا پکا پکا کر تھک گیا، پتا نہیں آپ خواتین کس طرح ہر روز کھانا پکا لیتی ہیں۔"

موضوع بدل گیا، الفت بھابی نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ مگر انہوں نے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا، گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا، کون تھا وہاں، وہی اکیلا گھر۔ صحن برآمدہ۔ اور کمرے، کوئی دیواروں سے کب تک باتیں کرے، اماں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ ایسا اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا، جس کی سزا قید تنہائی ہو، کتنے سنگدل ہیں بھائی جان۔ میری زندگی کی انہیں پروا ہی نہیں، لیے بیٹھے ہیں سیف اللہ حکیم

کی بیٹی کو کیا ہے ان کے پاس، مشکل سے ایک دو جوڑے کپڑوں کے دے دیں گے، اور وہ ان کی بیٹی کے عیش و آرام کی فکر میں دُبلا ہوتا رہے گا، فرج خریدے اپنی تنخواہ سے۔ ٹی وی کے قسطوں میں، اے سی بھی ضروری ہو گا، ہر چیز قسطوں میں لینی پڑے گی، وہ پاگل دیوانہ ہے کیوں نہ ایسی لڑکی سے شادی کرے لے، جو سب چیزیں جہیز میں لے کر آئے، مگر بھائی جان اتنا معمولی اور آسان سوال نہیں سمجھ پا رہے۔

گھر کے دروازے سے ٹیک لگائے کفیل بھائی بیٹھے تھے، دل شاد ہو گیا، پھر اُداس ہو گیا۔ اب وہ انہیں چائے تک نہیں پلا سکتا، جیب خالی ہے، کفیل بھائی منہ بھر کر پان کھائے بیٹھے تھے، منہ پھولا ہوا تھا۔

"ہاں بھئی، پھر کیا سوچا تم نے؟" انہوں نے اندر آتے ہی سوال داغا۔

"میں کیا سوچوں؟" وہ بے چارگی سے بولا۔

"تو پھر میری بات مان لو۔ چلے جاؤ حکیم سیف اللہ کے گھر اور باہر سے ہی آواز لگاؤ۔ کہ۔"

"کفیل بھائی، مذاق نہیں چلے گا۔ میں سخت پریشان ہوں، آپ اماں کو بلا دیں، سارے دُکھ دور ہو جائیں گے۔ میں انہی کو مسئلہ بتاؤں گا۔"

"وہ سو نیصد میاں فرہاد کی ہمنوا ہیں، میں بات کر چکا ہوں۔"

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ آپ کو بتا دے میں کھانا پکاتا ہوں، آلو چھیل چھیل کر میری انگلیاں آلو جیسی پیلی ہو گئی ہیں، اور میں بھوکا رہ رہ کر بالکل بھکاری ہو گیا ہوں۔ کپڑے تک دھونے پڑ گئے، استری بھی۔"

"میاں! قرض تو ہم دے دیتے ہیں تمہیں، مگر بات یہ ہے کہ یہ کوئی حل نہیں ہے، پکانا تو پڑے گا تمہیں ہی پھر بھی، کپڑے بھی دھونے پڑیں گے، ہم نے جو ترکیب بتائی تھی، اس میں فائدے ہی فائدے تھے، ٹوٹکے کی چوٹ جا کر منکوحہ سے کہو کہ چلو۔ وہ مفت میں آگئی، نہ بینڈ باجے کا خرچہ نہ جوڑے گھوڑے کا، آتے ہی لگا دو کام میں، ناشتا کھانا پابندی سے پکائے گی منہ بند کر کے۔ کپڑے دھوئے گی، گھر صاف کرے گی، مفت میں بڑی اولاد ہو جاؤ گے۔ اماں بھی خوش، تمہاری عاقبت بھی روشن۔ اور ٹھاٹھ سے حکم الگ چلانا۔"

"اور پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

"اللہ مسبب الاسباب ہے، اور ویسے ہم قرض تو دیں گے ہی۔"

"میں۔ کیا کوئی۔ مارے گا تو نہیں۔ کسی کی بیٹی کو۔" وہ نرم پڑ گیا۔

"اماں گھاٹ میں آپ، آپ شوہر ہیں، کس کی مجال ہے جو اعتراض کرے، اپنی بیوی کو لے کر آئیں گے، کسی کو اغوا تو نہیں کر رہے۔"

کفیل بھائی باہر سے گرم چائے لائے، کھانے کا بھی انتظام کر دیا۔ صبح ہوئی تو وہ الفت بھابی کے ہاں چلا گیا۔ اختر بھائی ناشتا کر رہے تھے، اسے بھی بلا لیا، وہ اکیلے تھے۔

"الفت بھابی کہاں ہیں، مجھے ان سے کچھ بات کرنا تھی، دراصل انہوں نے۔"

وہ اختر بھائی کو پوری بات بتانے لگا۔

"ارے اب تمہاری بھابی یہاں کہاں۔" اختر بھائی ہنسے۔ "ایک شکار پھنس گیا ہے اسی کو ٹھکانے لگانے گئی ہیں، اصل میں ان کی بہن کی کہیں شادی ہی نہیں ہوتی، بے چاری گونگی ہے، پولیو نے ٹانگ میں بھی نقص کر دیا۔ کوئی صاحب جنہیں لمبے جہیز کا لالچ دے کر پھانسا ہے۔ اسی کو اپنے ابا سے ملانے گئی ہیں، ہاں تم بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔"

"تو۔ تو پھر۔ وہ تو۔ بات ہی ختم، اچھا ان کی بھتیجی بھی تو ہیں۔"

"بھتیجی تو ہیں۔ کیوں تم اس میں انٹرسٹڈ ہو، ہمارے جاؤ گے پیچھے۔ جان بچا لو، بڑی خطرناک بھتیجی ہے، زبان پر آگ لگائے پھرتی ہے۔ ہر کسی پر شعلے برساتی ہے۔"

اختر بھائی ڈرے ہوئے تھے، "تمہاری تو شادی یعنی نکاح ہو گیا ہے پھر۔ کیا کوئی رشتہ لائے ہو۔ سوچ لو، چار منگنیاں توڑ چکی ہیں صاحبزادی بذات خود۔ بزبان خود۔"

"لیکن۔ بھابی تو۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ۔ میں۔ یعنی میرے ساتھ۔" وہ ہکلا تا رہا۔

"ارے ان کی نہ کہو۔ وہ تو ہیرے کی انگوٹھی، اور پانچ ہزار کے لالچ میں باؤلی ہو رہی تھیں، ایک دن مظہر احمد سے کہہ رہی تھیں، میری بہن سے شادی کرے۔ تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ۔ رہائش اور بیوی مفت۔ مظہر احمد کو نہیں جانتے۔ بھئی۔ ہمارے ہیڈ کلرک کا بیٹا ہے۔ ملازمت کے لیے میری سفارش چاہتا تھا، تو وہ تو بہن

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korner.com

اور بھتیجی کو کہیں بھی چپکانا چاہتی ہیں، آپا نے بیٹی کی شادی کرانے پر پانچ ہزار دینے کا کہا ہے، بھائی نے انگوٹھی، ہیرے کی انگوٹھی کا انعام رکھا ہے، اپنی بیٹی کی شادی بخیر و خوبی ہو جانے پر۔"

اس سے چائے بھی نہیں پی گئی، وہ بہانہ بنا کر اٹھا اور کفیل بھائی کے آفس پہنچا، خوامخواہ امید لگائی — ایک سہارا سا تھا کہ شاید اس کی زندگی کو کچھ فیض پہنچے، مگر وہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا، بھابی اپنا فائدہ دیکھ رہی تھیں۔ کفیل بھائی گردن ہلا ہلا کر اسے حقیقی پہلو سے آگاہ کرنے لگے۔

"پہلے آپ کسی طرح امّاں کو میری طرف ہلائیے میں ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گا۔" وہ ضدی بچے کی طرح گردن ہلا کر بولا۔

"پہلے تم اپنی مرضی چلا رہے تھے، اپنی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے، اب امّاں کا نام لے رہے ہو۔ خالہ جان نے صاف کہا ہے کہ جب تک ملیحہ گھر میں نہیں آجاتی انہیں چین نہیں ہے، اور کس طرح مرضی معلوم کرو گے؟"

اس روز اس نے دال پکائی، بے خیالی میں بیٹھے بیٹھے وہ اونگھ گیا۔ دال جل گئی۔ مگر وہ اتنا بھوکا تھا کہ جلی ہوئی دال بھی چبا گیا۔ کفیل بھائی نے کہا تھا کہ خالہ جان وہاں رہ کر تمہاری طرف سے مراد کا دل صاف کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اس طرح ان کی نفرت میں کمی ہو رہی ہے، مگر یہ کیسی کمی تھی کہ کبھی ان کے گھر کے کسی فرد نے اس کی طرف جھانکا تک نہ تھا، پوچھا تک نہ تھا کہ تم کیسے ہو؟ امّاں نے بھی اسے آواز تک نہیں سنائی تھی، بھائی جان چوبیس گھنٹے تو گھر میں رہتے نہیں ہیں، کفیل بھائی کے سوا کوئی اس کا ہمراز و ہمدرد نہ تھا۔ انہی کے پاس جا کر وہ کھڑے کھڑے کرکے دل ہلکا کر لیتا۔

الفت بھابی کی طرف جانے کا تو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ویسے بھی اس سے خفا تھیں، کفیل بھائی نے اسے ڈرایا کہ اگر وہ اختر بھائی کے گھر گیا تو ہیرے کی انگوٹھی کے شوق میں اس کو بھینٹ چڑھا لے گا، وہ دریغ نہ کریں گی۔ اس کے علاوہ پورے خاندان میں یہ خبر مشہور ہو گئی ہے کہ تم بھائی سے الگ ہو گئے ہو، اور اپنی امّاں سے بھی الگ رہ رہے ہو، اب کون تمہاری شادی کرائے گا، اور کہاں تمہیں وہ بلبے جہیز والی ملے گی، جس کی دولت سے تمہارے دلدر دور ہوں، سب تم سے ناراض ہیں کہ ضد میں آکر نہ صرف اپنے ہی خوا ہوں سے جدا ہو گئے، بلکہ گھر میں بٹوارہ کر لیا، اور ایک شریف و معزز انسان کو بیٹی کے باپ ہونے کے تصور کی سزا بھی دے رہے ہو، شرف اللہ نے صاف کہہ دیا ہے کہ ان کی بہن اب سدا ان کی دہلیز پر بیٹھی رہے گی، وہ ایسے خود سر نا عاقبت اندیش آدمی کے ساتھ اس کی قسمت پھوڑنے کے حق میں نہیں۔

شرافت کے ذکر سے اس کو متلی ہونے لگی تھی، وہ بھی تو شریف تھا، مگر چیر چا نہیں کرتا تھا، اس نے ذرا روشن مستقبل کے خواب دیکھے تھے، ان خوابوں سے کسی کا نقصان کیا ہوا؟ ہر انسان کو حق ہے خواب دیکھنے کا۔

رات کو اسے بخار آگیا، موسم بھی خراب نہ تھا، شاید محنت زیادہ سوچ بچار اور محنت نے اسے کمزور کر دیا۔ کوئی مددگار نہیں، ہمدرد نہیں، رات میں بخار کی شدت میں اضافہ ہو گیا، کمرے میں پانی نہیں تھا، پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، اس نے کمرے سے باہر جانا چاہا، مگر آنکھیں میں اندھیرا چھا رہا تھا، کمرہ لاک کرکے چابی پتا نہیں کہاں رکھ دی تھی کہ ملی ہی نہیں، پانی تو باتھ روم میں بھی مل جاتا اس لیے چابی کی فکر ہو گئی، اگر وہ کمرے میں بند ہو گیا، تو کوئی اس کی چیخ و پکار پر کان نہیں دھرے گا، اور وہ کمرے میں سفید ہو جائے گا۔

بخار کی گرمی کے باوجود جسم میں خوف کی ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی، اور آناً فاناً پسینہ آگیا۔ بخار کم ہو گیا، لیکن چابی کی تلاش کے وہ چند منٹ اسے خوف کی ایک ایسی دنیا کی سیر کرا گئے، جس نے سوچنے اور عمل پر مجبور کر دیا، تنہائی کا زہرناک احساس بے بسی اور مجبوری، انسان دوسرے انسان کی رفاقت کے بغیر کیسا مجبور اور خوفزدہ ہوتا ہے۔ اگر چابی نہ ملی ہوتی، وہ کتنے دن بغیر غذا کے رہ سکتا تھا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا، خطرے کا اعلان تھا، تنہا انسان کو کوئی بھی مصیبت گھیر سکتی ہے۔

چھٹی کا دن تھا، سبز روغن کے بدرنگ پرانے دروازے پر زور کی دستک ہوئی تھی، مہینہ کا آخر تھا اور سب کو معلوم تھا کہ ان دنوں کوئی اچھی چیز نہ تو پک سکتی تھی، نہ بازار سے آسکتی تھی۔ ملیحہ نے چنے کی دال دھو کر رکھی تھی، آپا کئی دن سے پھوپھو کے ساتھ مشورے کر رہے

تھے، پھوپھو کئی مہینے بعد ان کے گھر کسی خاص مقصد کے لیے آئی تھیں اور مسلسل آپا امّی سے باہم مشورے کر رہی تھیں، آپا تو زیادہ تر خاموش رہتے، کبھی کبھی امّی دبی زبان سے کوئی احتجاجی جملہ بول دیتیں۔

شرف اللہ بھائی دانتوں سے ہونٹ چباتے ادھر سے اُدھر ٹہلتے، فیض بھی کچھ پریشان سا تھا، اس کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ کسی سے پوچھ لیتی۔ پھر جب وہ دال چڑھا لے کچن میں گئی، ساتھ کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ امّاں کافی غصے میں تھیں، وہ پھوپھو سے بول بھی نالاں تھیں، آپا بھی خوش نہ تھے مگر بہن تھیں اس لیے کچھ کہتے نہ تھے۔ پچھلی بار جب وہ آئی تھیں تو اپنی دونوں بیٹیوں کو ساتھ لائی تھیں، ان کی خواہش بلکہ اصرار تھا کہ دونوں لڑکیاں شرف اللہ اور فیض سے بیاہی جائیں۔

شرف اللہ نے جب سے ڈاکٹری کا امتحان دیا تھا، خاندان کے لوگ چونک گئے تھے، اور بیٹی والے تو ان کے گھر کے چکر لگاتے رہتے تھے، مگر شرف اللہ کی نے متاثر کیا۔ پھوپھو ان سب سے ملیحہ کے نکاح کے زمانے سے بہت خفا تھیں، کیونکہ ان سے مشورے کے بغیر ہی یہ نکاح کر دیا گیا، حالانکہ وہ خود اپنے بیٹے کا رشتہ دے چکی تھیں، اور سر طرف سے دباؤ ڈلوا رہی تھیں کہ ان کے گاؤدی نکمّے بیٹے سے ملیحہ کی شادی ہو جائے، اور شرف اللہ کو ذرا پسند نہ تھا، بدھو اور ڈھیلا ڈھالا، اس کی ٹانگ میں لنگ تھا، اور وہ کسی گودام میں منشی تھا۔ شرف اللہ کا اعتراض یہی تھا کہ منشی کو کتنی ترقی ہو سکتی ہے، وہ اپنی بہن کی قسمت کے ساتھ "مذاق" کرنے کے لیے راضی نہ تھے، پھوپھو کا کہنا تھا کہ اسے ان کے بیٹے کو ترقی کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ذاتی گھر ہے، ملیحہ تعلیم حاصل کر رہی ہے، وہ سروس کرے گی، باپ کا تنکہ سے بیٹے کو بھی ملے گا، نہ کرے تو تانبے کے چند برتن، چاندی کے کچھ برتن۔ اور گھر کا کاٹ کباڑ۔

پھوپھو کے تقاضوں سے ڈر کر ہی شرف اللہ نے مراد بخت کے رشتے کو قبول کیا تھا، اور آپا کی نیم دلی کی پروا نہ کرکے امّی کے ذریعے نکاح کی تاریخ مقرر کی تھی، اسی بات پر وہ بے حد ناراض ہو گئی تھیں، وہ اس کے نکاح میں شریک بھی نہیں ہوئیں۔ پھوپھو بیٹیوں کی پیش کش لے کر آئی تھیں، جسے شرف اللہ نے سختی سے رد کر دیا۔

اب کئی ماہ کے بعد وہ آئی تھیں اور ملیحہ جانتی تھی کہ اس بار بھی وہ اسی کے سلسلے میں آئی ہیں، آپا کی خاموشی امّی کا احتجاجی رویہ، شرف اللہ کی فکر انگیز نگاہیں، صاف کہتی تھیں کہ وہ سب ملیحہ کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے متردد بھی ہیں، آمادہ بھی۔

مراد بخت کی اماں کئی بار آئی تھیں، اور امّی کو تسلی دے کر جاتی تھیں مگر شرف اللہ کو مراد کی جانب سے مایوسی ہو رہی تھی۔ اس کے انداز پر وہ جز بز رہتا، کبھی کہیں شرف اللہ سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو نظریں چرا کر پلٹ جاتا۔ وہ ملیحہ کا بڑا بھائی ہونے کے ناتے مراد بخت کے لیے وہ حیثیت نہیں رکھتا، جس کی انہیں توقع تھی۔ پھر انہیں یہ بھی علم ہوا کہ وہ رخصتی کرانے سے کترا رہا ہے۔ آپا نے کتنی بار بڑے بھائی فرہاد بخت کو کہلایا مگر ادھر سے کوئی جواب نہ ملا، اور شرف اللہ نے اس کے ناروا رویے سے تنگ آکر وکیل سے بات بھی کی، تاکہ بہن کو اس نامعقول بندھن سے چھٹکارا دلا دیں، ابھی یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا تھا کہ سنا دونوں بھائیوں میں علیحدگی ہو گئی ہے اور گھر کے حصے تقسیم ہو گئے، اب فرہاد بخت بھی دامن بچانے لگے۔ ظاہر ہے کہ وہ رخصتی تو کرا نہیں سکتے تھے، ملیحہ دل میں پیچ و تاب کھاتی رہتی۔

فیض نے ایک دن دبی زبان سے کہا تھا کہ مراد بھائی قیمتی جہیز کے خواہاں ہیں، اور ہمارے پاس معمولی چیزیں بھی نہیں۔ کیونکہ ان کی امّی نے تو صرف ملیحہ کو مارکا تھا۔ اسی کی ذات کو اپنے بیٹے کی قسمت کا تاخدا قرار دیا تھا، مگر مراد بھائی —

اس کا دل چاہا وہ مراد کو خط لکھے۔ اسے یاد دلائے کہ جب اس کا پیام آپا نے منظور کیا، اس وقت وہ محض ایک طالب علم تھا۔ اور اس کے مستقبل کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا۔ ہم نے تو کوئی مطالبہ نہیں کیا، کوئی شرط نہیں رکھی۔ اب بھی اس کی ملازمت اتنی ترغیب آموز تھی کہ کوئی فخریہ اپنی بیٹی اس کو دے، مگر آپا نے صرف ان کی خاندانی حیثیت اور لڑکے کی شرافت کے نام پر اپنی انمول بیٹی کو نامزد کر دیا۔ دنیاوی ساز و سامان پر ناز کرنے والے نمائشی اسباب تعیشی کے رسیا لوگوں کو اپنے عمل پر بھی غور کرنا چاہیے، کہیں لکڑی اور شیشے جیسی ناپائیدار اشیاء کے لیے وہ کسی کا دل تو نہیں توڑ رہے، کسی کی عزت کو کھیل سمجھ کر مجبوریوں کا سودا کرنے والو، یہ دنیا تو چند روزہ ہے، ایک بندھن اگر مضبوط ہے تو اتنا ہی کمزور بھی، اصل میں اس طاقت کو بھول کر جس

Scan & PDF MADE BY Hina Kornel

نے انہیں یکجا کرنے کے مواقع عطا کیے، انسان نئی خوشیوں کی راہ تلاش کرنے لگتا ہے، مگر اسے ملتا کیا ہے؟ لالچ کا بدلہ مایوسی اور رسوائی۔

لیکن وہ مشرقی لڑکی کی روایات کی حامل، اپنے جذبات کا اظہار زبان سے تو کجا، قلم کے ذریعے بھی نہ کر سکی اس نے مراد بخت کو دیکھا تھا، اور وہ اسے اچھا لگا شاید یہ ان دو دلوں کا نتیجہ تھا، جس نے اسے مراد کے نام کے ساتھ نتھی کر رکھا تھا۔

مراد نے اسے دیکھا تھا یا نہیں، اس کا علم بھی نہ ہو سکا وہ بہت کم کسی تقریب میں شریک ہوتی تھی، اسے ابا کی طبیعت کا اندازہ تھا، جو لڑکی کو پردے میں رکھنے کے حامی تھے، اشرف اللہ اور فیض سے انہیں اختلاف تھا، اور نئے زمانے کے لوگ جس قسم کا اختلاف رکھتے ہیں اس سے کون واقف نہیں، اسی اختلاف نے شرف اللہ کو سائنس پڑھنے اور میڈیکل جوائن کرنے کی راہ دکھائی، حالانکہ ابا تو انہیں حکمت سکھانا چاہتے تھے۔ اور اکثر اس معاملے میں ان کی بحث ہوتی تھی، شرف اللہ نے ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ اگر ملیحہ کو اس قدر پردے کی بولبولہ بنایا ہوتا، تو میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ مراد بخت رغبت ہی نہیں لیتا اور نہ اسے کسی جہیز کا لالچ ہوتا۔

وہ بے دلی سے چولھے کے پاس بیٹھی تھی جب امی نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"آپا خدا کا خوف کریں، ہمارے خاندان میں کب کسی لڑکی کی طلاق اور خلع ہوئی ہے۔ یہ تو شرف اللہ کا جوش تھا، جو وہ وکیل سے مشورہ کرنے پہنچ گیا، خاندان کی عزت پر لڑکیاں قربان ہو جاتی ہیں مگر بدنامی کا یہ ٹیکہ نہیں لگاتیں، اور ملیحہ میری بیٹی ہے اگر وہ مراد کے گھر باعزت طور پر نہیں گئی تو باپ کی دہلیز بھی پار نہ کرے گی۔"

"تم تو پاگل ہو۔ لڑکی کو عمر بھر بٹھانا گناہ ہے، اگر مراد بدبخت ہے تو اسے تو کم نصیب نہ بناؤ، شاید خدا کا یہی اشارہ ہے کہ ملیحہ میرے گھر کی زینت بنے۔ ارے اس اشارے کو سمجھو بھائی، اور اللہ کا نام لے کر مراد سے چھٹکارے کا بندوبست کرو، قدرت کے ہر عمل میں مصلحت ہوتی ہے، اب مراد کی ماں اور بھائی بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کس امید میں اس پر قناعت کر رہی ہو، وہ لڑکا۔ بہت لالچی اور دغاباز ہے۔ ملیحہ اس کے گھر کبھی خوش نہیں رہ سکتی، وہ تم سے لاکھوں کا جہیز مانگے گا۔"

"آپا! کچھ دن انتظار تو کر لیں، ابھی ہم کو صاف انکار تو ملا نہیں ہے، ادھر ادھر کی سنی سنائی پر یقین نہیں کرنا چاہیے نکاح ہوا ہے، کوئی زبانی بات تو نہیں ہوئی، میں اپنی بچی کو کسی غیر مرد کے سامنے سوال جواب کے لیے نہیں بھیجوں گی، علامات سے اللہ بچائے۔"

"چاہے بیٹی کڑھ کڑھ کر ختم ہو جائے، بھابی، یہ سب پرانی باتیں ہیں، اب نیا زمانہ ہے، وکیل خورتیں بھی ہوتی ہیں، انہی سے مشورہ کر لو۔"

"پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔" شرف اللہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "ہم زیادہ انتظار نہیں کریں گے، لوگ مذاق اڑاتے ہیں، چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اب میں لوگوں کی سوالیہ نظروں سے عاجز آ گیا ہوں، اگر ملیحہ کی قسمت میں مراد بخت کا گھر نہیں ہے، تو نہ سہی، پھپھو پھو کا گھر ہی سہی۔"

شرف اللہ نے یہ کہا کہہ دیا تھا، ملیحہ کے کانوں میں جیسے گرم سیسہ پگھلا کر انڈیل دیا۔ اس کے ہاتھ میں چمچہ تھا۔ جو ایک کربناک آواز کے ساتھ چولھے پر گرا، جس پہ پکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

شرف اللہ ہی تو سب سے زیادہ پھپھو کے بیٹے کے خلاف تھے، بھائی تمہارا سہارا ابھی اتنا کمزور، اتنا ناپائیدار، کچھ کہنے سے پہلے ہمیں سے تو پوچھ لیتے، کاش تم بھی امی کی طرح کہہ سکتے، وہیں تمہارے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر مراد بخت کا یا موت کا انتظار کر سکتی ہوں، کسی دوسرے کے گھر میں جانے کا تصور موت سے بڑھ کر ہوتا ہے، کاش کوئی بھائی اتنا جی دار ہو۔ مگر سب کو دنیا کی، لوگوں کی، ننگا ہوں کی فکر رہتی ہے، اسے ابھی دال بگھارنی تھی، روٹی پکانی تھی، مگر جسم میں شعلے بھڑک رہے تھے، دل کر چی کر چی ہو رہا تھا، وہ اپنے بکھرے بکھرے وجود کو سنبھالتی، گھسیٹتی صحن میں پڑے پلنگ پر آ گری۔

غربت بھی کیا بری چیز ہے۔ ایک جہیز نہ دے سکنے کے جرم میں کسی لڑکی کو اتنی بڑی سزا۔ جو زندگی کا ساتھی بننے والا ہو وہی منہ پھیرلے، اور دولت کا تقاضا کرے، تو والدین کہاں سے پورا کریں گے، وہ ساز و سامان، اور اب پھپھو پھو کا وہ لونگا بیٹا، اسے فتح کرنے آئے گا، جیسے وہ جاندار نہ ہو، کوئی زمین کا ٹکڑا، یا عمارت ہو پتھر کی۔ اینٹوں کی اور گارے کی بنی ہوئی۔ فضا میں خون کی سی بو تھی، جیسے کسی ناتواں دل کے قتل کے بعد، بہنے والا خون

اپنی مہک چھوڑ گیا۔

مراد بخت تم سے رشتہ ٹوٹا تو سمجھ لو زندگی سے ناتا ٹوٹ گیا، وہ زندگی ہی کیسی جو تمہارے بغیر گزرے، تمہارا تصور، تمہارا خیال جو دن رات کے ہر لمحے میں امید اور خوشی کے چراغ جلاتا تھا، مجھے دولت کی نہیں، عیش آرام کی نہیں صرف تمہاری، تمہارے وجود کی ضرورت تھی، ہم دو مل کر ایک ہو جاتے اور میں کبھی بھی تمہیں مایوس نہ کرتی، مگر اب۔ شرف اللہ اور پھپھو کے ارادے۔

"بیٹا جاؤ! جا کر نہا لو، تم چولھے کے پاس نہ جانا، تمہاری ماں ہانڈی دیکھ لیں گی۔"

ابا اس کے قریب کھڑے تھے، ہمدرد، غمگسار، ان کا لہجہ زخمی تھا، ان کی آواز میں غموں کا، مایوسی کا اور دلجوئی کا عنصر شامل تھا، شاید وہ اس کے حال پر دکھی تھے، اس کی قسمت سے مایوس تھے، وہ روتے رہے ہوں گے، امی کے سامنے آئیں تو وہ بھی نمناک آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں، شاید سب لوگ بیٹی کو قربان کرتے ہوئے آنسو بہاتے ہیں اس نے ملجگی نظروں سے ابا کو دیکھا۔ ابا اس کی نگاہوں کے پیام کو سمجھ گئے، تڑپ گئے۔

پھر وہ سر جھکا کر غسل خانے میں چلی گئی، نہانے کے بہانے آنسو بہاتی رہی، یہی اس کے اختیار میں تھے۔

"مراد! یاد رکھنا، میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں گی، میری بددعائیں تمہیں ہر خوشی سے محروم رکھیں گی۔ چار برس میں تمہارے تصورات کے محلوں میں مقید رہی۔ خوابوں کے سنہری جزیروں میں تمہارے ساتھ سفر کرتی رہی، اپنے لیے اور تمہارے لیے خوبصورت محل بناتی رہی۔ آرزوؤں کے ہنڈولے میں جھولتی رہی، تم نے مجھے میری بے گناہی کی اتنی بڑی سزا کیوں دی، تم سے خدائی۔ میری عبادتوں، ریاضتوں اور دعاؤں کا تم پر کوئی اثر کیوں نہ ہوا، میں جو معصوم تھی، تمہارے سوا کسی کے تصور کو بھی دل میں جگہ نہ دیتی تھی، کہ تم ہی میری عزت، میرا مان، میری محبت میری مسرت اور زندگی تھے، میں اب تمہیں کہاں پاؤں گی۔"

"میری بیٹی گلابی رنگ کے دوپٹے میں کیسی چاند کی طرح چمک رہی ہے، آہا۔ اس حور سے میرا گھر پُر نور ہو گا، بھائی! ذرا اپنے لفافوں میں سے کالا دانہ نکالنا میں بچی کی نظر اتار دوں۔"

پھپھو کی آواز انگارے کی طرح سماعت پر برسی۔

اس نے سر جھٹک کر خود کو اس تصور سے نجات دلائی۔ آہ اب تو تصور بھی گناہ ہو گا۔

"اوئی!" پھپھو پھو دستک کی آواز پر اچھل پڑیں۔ "یہ دستک ہے کہ دھماکا، توبہ، کون جنگلی ہے، جیسے قیامت ساتھ لایا ہو۔"

شرف اللہ دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگے، آنے والا بے دھڑک اندر گھس آیا۔

"یہ ہم آئے ہیں، مراد بخت، اپنی امانت لینے کے لیے، حکیم صاحب! پہچانتے ہیں نا۔"

توبہ۔ ملیحہ کو چکر سا آ گیا، یہ تصورات کتنے ظالم ہوتے ہیں، وقت دیکھیں نہ موقع۔

"ملیحہ بیگم! ہم تمہیں لینے آئے ہیں، دستور کے مطابق تو بارات کے ساتھ ایک بار آ چکے تھے، اب تنہا آ گئے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم پر کسی کا دباؤ تھا، اگر تمہاری مرضی ہے، تو اسی وقت اسی طرح ہمارے ساتھ چلی چلو، تم پر کوئی جبر نہیں ہے، میرا گھر۔ تمہارا منتظر ہے اور میں بھی۔"

یہ خواب تھا کہ بیداری، وہی الفاظ، وہی دلکش آواز، وہی سحر انگیز شخصیت جو اس کی آنکھوں میں، خیالوں میں، ہمہ وقت تیرتی رہتی تھی۔

مراد بخت اس کے خوابوں سے نکل کر اس کے باپ کے آنگن میں آ کھڑا ہوا، تنہا مگر مضبوط، بے باک اور نڈر، اس کی آنکھیں ملیحہ پر جم گئی تھیں۔

شرف اللہ نے جو سکتا لگا کے سے کھڑے تھے، آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا، مگر امی بجلی کی سی تیزی سے آئیں، شرف اللہ کو دھکا دے کر بولیں۔

"ہاں۔ ہاں۔ ملیحہ۔ بیٹی تم پر کسی کا جبر نہیں، تم آزاد ہو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرو۔"

امی کی آواز میں مضبوطی تھی، وہ کانپتے قدموں سے اس کی طرف بڑھی۔ تبھی پھپھو شور مچاتی ہوئی، اس کی طرف جھپٹیں، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے، امی پر اعتماد کرے، یا پھپھو پھو کی دادبلا پر دھیان دے، اس نے دو قدم پیچھے کھڑے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود تھے، مگر نظر ملتے ہی بیٹی کی جانب آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں نرم نرم جذبے آنسوؤں کی طرح چمک رہے تھے، خوشی کی، تشکر کی ایک گلابی کرن ان کے ہونٹوں پہ بکھر بکھر گئی۔

Pdf & Scan by AHMED Friends Kohat.com

ملیحہ کے سر پر گلابی دوپٹے کا آنچل ڈالتے ہوئے وہ وفورِ جذبات سے کپکپا رہے تھے، وہ مضبوط قدموں سے مراد بخت کی جانب بڑھی، اب اس کی ٹانگوں کی تھرتھراہٹ مٹ چکی تھی، دل کی دھڑکن بھی اعتدال پر تھی، خوابوں کا سفر تمام ہوا، قسمت کی خوشنما دھنک اس کے گرد حصار کر چکی تھی، وہ ایک زندہ سفر پر روانہ ہونے کے لیے ایک ایک قدم اپنی منزل کی طرف بڑھا رہی تھی۔

مراد بخت حیرت زدہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھا، چند لمحے پیشتر کی دلیری اور بے باکی رخصت ہو چکی تھی، ملیحہ سیف اللہ کے چہرے پر عزم و اعتماد اور یقین کی روشنی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی، مراد بخت کے اندازوں سے بڑھ کر۔

صبح جب اس نے کفیل بھائی کے مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تھا، تو اسے صرف گھر کے لیے ایک کارکن کی ضرورت تھی۔ شدید ضرورت، کھانا پکانے کے لیے، کپڑے دھونے، استری کرنے، گھر صاف کرنے، اور بوقتِ ضرورت ان کی مدد کرنے کے لیے، تنہائی سے بچنے اور دل بہلانے کے لیے۔ اس نے کفیل بھائی سے کہہ دیا تھا، اپنی خواہش اور آرزو کے خلاف وہ حکیم کی بیٹی کو گھر لائے گا، تو اس کی کوئی مروت نہیں کرے گا، کسی قسم کی رعایت نہیں دے گا۔ اور شاید محبت بھی نہیں کرے گا۔

مگر آج پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کسی ارادے پر قائم نہیں رہ سکتا، کوئی دھونس کامیاب نہیں ہو گی۔ وہ اس صبیح رخساروں اور سیاہ آنکھوں والی پُرعزم حسینہ کے سامنے ہار سا گیا تھا، وہ پری چہرہ، گلبدن، بہادر و پُراعتماد لڑکی، اس کی آواز کے ساتھ ہی، اپنے باپ، اماں، بھائی کو چھوڑ کر اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ان دونوں نے ایک ساتھ باہر کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے، وہ جو صدیوں سے مراد بخت کی منتظر تھی، اس کی پہلی آواز پر ہی چل پڑی تھی، خالی ہاتھ، اب مراد بخت کو بھی کسی جہیز یا قیمتی ساز و سامان کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی، ملیحہ نے اس کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے، ان کے عمل کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا، اور پہلی نظر نے ہی اسے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ملیحہ کی معیت میں حکیم سیف اللہ کا دروازہ عبور کرتے ہوئے مراد بخت کو محسوس ہوا جیسے وہ ستاروں پر کمند ڈال کر کامیاب لوٹا ہو۔ ایک روشن ستارے کے ہمراہ، زندہ سفر اتنا پُربہار ہو گا، خوشبو کے قافلے ہم رکاب ہوں گے، یہ وہ نہیں جان سکتا تھا۔ کامرانی اور خوشی اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھی۔ وہ پُرامید اور پُرعزم ہر رکاوٹ کو پار کرتے ہوئے اپنی گلی میں داخل ہوا۔

"میرا گھر۔ چھوٹا سا ہے، میں تنہا رہ کر پاگل ہو گیا تھا، اب تم۔ میرے گھر میں روشنی بھر دینا۔"

صحن کا تالا کھول کر اندر قدم رکھتے ہی دونوں ٹھٹھک کے بن گئے، ایک انہونا، بے یقین منظر سامنے تھا، صحن کی وہ اونچی دیوار جادو کی طرح غائب ہو چکی تھی، اس کا ملبہ کیا کوئی نشان تک باقی نہ رہا تھا، صحن میں روحی، صبوحی اپنی تمام سہیلیوں کے ساتھ ڈھولک بجا رہی تھیں، اگاری تھیں، گھر بہانوں سے بھرا پڑا تھا، بھابی بندری ساڑی پہنے ان کی سمت دوڑتی آ رہی تھیں، شہزاد اور اماں عین دروازے پر ایستادہ تھے، بھائی جان کسی کوتے سے جن کی طرح نمودار ہوئے اور ملیحہ کا بازو پکڑ کر اندر لے جانے لگے۔

مراد بخت اماں سے لپٹ گیا، جن کے نرم اور پُرشفقت بازو سائبان کی طرح اسے اپنے سائے میں لے چکے تھے، ملیحہ سبک قدم اٹھاتی اندر کی سمت بڑھ رہی تھی، بھائی جان تنادر درخت بن گئے تھے، ایک سہانا سفر تھا دروازے سے برآمدے تک کا۔

مراد بخت پر گھبراہٹ، بوکھلاہٹ اور حیرت سوار تھی، صبوحی اور روحی کے ساتھ کفیل بھائی بھی گانے گا رہے تھے، گھر کی کایا پلٹ کی وجہ۔ اب سمجھ میں آئی، جس گھر کو وہ چھوٹا کہتا تھا۔ دیوار گرنے سے بڑا اور روشن ہو گیا تھا، تنہائی کا وجود ہی نہ رہا تھا۔ روحی، صبوحی، شہزاد اماں، بھائی جان اور بھابی۔ وہ کفیل بھائی کو مارنے کے لیے جھپٹا تو قہقہوں سے پورا گھر گونج اٹھا۔

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com